© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

النبأ العظیم

(۳)

۱۸۵۷ء کے ہنگامے فرو ہونے کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کے لیے حالات اس درجہ حوصلہ فرسا اور ہمت شکن تھے کہ قدم قدم پر ان کو اپنی ذلت اور رسوائی کا احساس ہوتا تھا اور محسوس یہ ہوتا تھا کہ انگریزی حکومت و اقتدار کی صورت میں جو بدقسمتی ان پر مسلّط ہوگئی ہے اب وہ دور نہیں ہوگی اور یہ لیل و نہار کبھی نہ بدلیں گے۔ سرسید احمد خاں بے حد حسّاس اور سخت منفعل طبیعت کے انسان تھے۔ ان کو ملتِ بیضا کی ذلت و نکبت کا احساس اس درجہ شدید ہوا کہ انھوں نے وطن کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دینے اور سرزمینِ مصر میں جا بسنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن یہ خیال فوری اور ہنگامی تاثر کا نتیجہ تھا۔ پھر جو ذرا غور کیا اور سوچا تو غیرت و حمیتِ قومی نے عار دلائی کہ پوری قوم کو ایک غاصب قوم کے منہ میں نوالۂ حرص و آز بنتے ہوئے دیکھنا اور اس کو کس مپرسی و بے کسی کے عالم میں اس کی قسمت پر چھوڑ کر ترکِ وطن کر جانا اور اپنے لیے ایک گوشۂ عافیت ڈھونڈھ نکالنا سخت بے غیرتی اور نامردی کی بات ہے۔ اس کے علاوہ آسمان کو رنگ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ انقلاب ہر طرح پر ہوتا ہے۔ بیڑے ڈوبتے ہیں تو کبھی ڈوبنے کے بعد اچھل بھی آتے ہیں اور پیر جاتے ہیں۔ قومیں سدا ایک ہی حالت میں نہیں رہتیں۔ عزت و ذلت اور نکبت و رفعت وقت کی گردن کا جوا ہیں۔ اس لیے دن اور رات کی طرح پہلو بہ پہلو ایک دوسرے کے ساتھ ادلی بدلی کرتے چلتے ہیں۔ اس لیے سرسید نے سوچا کہ یہیں ہندوستان میں قوم کے ساتھ اپنا مقدر وابستہ کر کے ان کو حضیضِ بذلت سے نکال کر مصطبۂ عزت و رفعت پر لانے کی بابت جدوجہد کرنی چاہیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ وہ اس خیال کو عزمِ بالجزم بنا کر ہندوستان میں رہ پڑے اور ترکِ وطن کا خیالِ خام دماغ سے نکال دیا۔

اب سرسید نے تحریک شروع کرنی چاہی تو ضروری تھا کہ پہلے وہ ملک کے داخلی اور خارجی حالات و موثرات کا دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیں تاکہ ان کی روشنی میں وہ تحریک کا صحیح رُخ اور اس کی سمت متعین کر سکیں۔ انھوں نے اپنی اور باہر کی دنیا پر نگاہ ڈالی تو انھیں یہ چیزیں نظر آئیں:۔

(۱) ملکی حکومتِ وقت، برطانوی قوم کی نمائندہ اور ان کی پارلیمنٹ کے سامنے اپنے اعمال و افعال کے لیے جواب دہ اور اس کے تابع فرمان ہے۔

(۲) انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے سخت عناد اور تعصب ہے اور یہ ناسور نیا نہیں بلکہ بہت پرانا ہے۔

(۳) وقت علومِ جدیدہ اور افکار نو کے پَر لگا کر بہت آگے بڑھ گیا ہے اور مسلمان اوہام و وساوس کی زنجیروں میں اسیر ہو کر بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اب اگر زندہ رہنا ہے تو ان علوم کو اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

(۴) جس طرح انگریزوں کو مسلمانوں سے عناد اور نفرت ہے اسی طرح مسلمان بھی اپنے مذہب کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کے باعث انگریزوں سے سخت نفرت کرتے اور انہیں نجس و ناپاک سمجھتے ہیں۔

خارجی اور داخلی حالات کا یہ تجزیہ کرنے کے بعد سرسید نے یہ طے کر لیا کہ ان کی تحریک کا رُخ کیا ہوگا اور انھیں کتنے محاذوں پر کام کرنا ہوگا۔ انھوں نے جو محاذ متعین کیے وہ مذکورہ بالا تنقیحات کے مطابق تھے۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بظاہر یہ سب کام بیک وقت انجام دینا تنہا ایک شخص کی استطاعت سے باہر تھا اور اس کے لیے ایک ادارہ یا ایک جماعت درکار تھی لیکن ہزار آفریں ہو اس مردِ خدا کی ہمت و جرأت پر۔ وہ اکیلا اور تنِ تنہا اُٹھ کھڑا ہوا اسے یقین تھا کہ سفر تو شروع ہونا چاہیے۔ محض ساتھیوں کے انتظار میں بیٹھے رہنا شرطِ مردانگی نہیں ہے۔ جب آدمی سفر کرتا ہے تو راہ میں ساتھی خود بخود ملتے رہتے ہیں۔

سرسید کا اصل مقصد تعلیم جدید کے ذریعہ مسلمانوں کے واسطے اصلاح و ترقی اور خود اعتمادی و عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سروسامان کرنا تھا لیکن ان کو یقین تھا کہ یہ کام اس وقت تک سرانجام نہیں ہو سکتا جب تک کہ انگریزوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب نہ لایا جائے اور ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باہمی غلط اندیشیوں اور بدگمانیوں کو دور نہ کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے کتاب "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھی۔ یہ کتاب اس درجہ موثر ثابت ہوئی کہ برطانوی پارلیمنٹ میں اس پر بڑی بحث ہوئی انگریزوں نے ہندوستان میں جو کچھ کیا تھا اس پر ان کو ندامت کا احساس ہوا گویا اس کتاب کا ہی اثر تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کے معاملہ میں سوچنا اور اپنے رویہ پر نظرِ ثانی کرنا شروع کیا۔ علاوہ ازیں میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب نہایت مفصل و مبسوط اور بڑے درد اور اخلاص کے ساتھ لکھا۔ مشنریز نے اسلامی روایات و تعلیمات اور سیرتِ نبوی سے متعلق یورپ میں جو زہر پھیلایا تھا۔ سرسید نے یہ کتاب لکھ کر اس کے لیے تریاق مہیا کرنے کی کوشش کی۔ پھر کتابِ مقدس کی شرح بھی لکھی۔ یورپ کا اس زمانہ میں سفر کتنا مشکل تھا۔ مگر سرسید نے اس کو بھی انگیز کیا اور انگلینڈ پہنچ کر حکومت اور پبلک کے عمائد و زعماء سے ملاقات کی۔

ایک طرف سرسید مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کی نفرت و عناد کو دور کرنے اور ان کو مسلمانوں سے قریب تر لانے کی یہ کوشش کر رہے تھے اور دوسری جانب وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ مسلمانوں پر جو وقت پڑا ہے قانونِ فطرت کے مطابق یہ بے سبب نہیں ہے اس میں خود مسلمانوں کے اس علمی، اخلاقی انحطاط اور افلاسِ فکر و نظر کو دخل ہے جس میں وہ مغل سلطنت کے دورِ زوال میں مبتلا ہو گئے تھے اور جس کے باعث زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جو دامن صد چاک نہ ہو۔ اس بنا پر سرسید کو مسلمانوں کے فکری اور علمی و اخلاقی اصلاح کا کام کرنا بھی ضروری تھا۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ جب تک مسلمانوں میں ذہنی طور پر انگریزی اور علومِ جدیدہ کی تعلیم کی اہمیت و ضرورت کا احساس اور اس کو بطیبِ خاطر قبول کر لینے کے لیے آمادگی نہیں ہوگی ان کے حالات میں انقلاب پیدا نہیں ہوگا اور یہ احساس اور آمادگی صرف اسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب کہ ان کی فکری اور ذہنی سطح اونچی ہو۔ اور جن سخت بیہودہ اوہام و خرافات میں مبتلا ہیں ان سے نجات یاب ہوں۔ اس اہم کام کو سرانجام دینے کی غرض سے سرسید نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس میں پابندی اور تسلسل کے ساتھ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی غرض سے نہایت پُر زور، موثر اور سبق آموز مضامین و مقالات خود لکھے۔ دوسروں سے لکھوائے اس کے علاوہ قرآن مجید کی تفسیر لکھی اور دوسری کتابیں تصنیف کیں۔ ملک میں گھوم پھر کر لکچر دیئے۔ جگہ جگہ تقریریں کیں۔ جن میں خود روئے اور سننے والوں کو رُلایا۔ حالی سے مسدس لکھوائی۔ نذیر احمد کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصلاحی ناول لکھنے پر لگایا۔ اور شبلی کے دل میں اسلامی تاریخ پر داد تحقیق دینے کا جذبہ پیدا کیا۔ غرضکہ سرسید نے امیر عسکر کی حیثیت سے اپنے ارد گرد ارباب علم و قلم اور اصحاب فکر و دانش کی ایک ایسی فوج گراں اکٹھی کر لی جو وقت اور زمانہ کے ہر محاذ پر مسلمانوں کی طرف سے دفاع کر کے ان کو آگے بڑھنے کے قابل اور لائق بنا سکے۔

تجدید و اصلاح کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی کسی طبقہ بنی نوع انسان کی فکر و نظر اور جہد و عمل کی طاقتیں مفلوج اور از کار رفتہ ہو جاتی ہیں اور فطرتِ انسانی کا نورِ شعور اوہام و اساطیر پرستی کے پردوں میں مستور ہو کر نیک و بد کا امتیاز کھو دیتا ہے تو اب یہ طبقہ موت کو زندگی سمجھتا ہے۔ بیماری کا نام اس کے ہاں صحت قرار پاتا ہے۔ زہر ہلاہل پر شہد و انگبیں کا گمان گذرتا ہے اور زخم مسکراتے ہیں تو اس سے خندۂ گل کی طرح لطف و سرور حاصل کرتا ہے چنانچہ سرسید کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ انھوں نے وادیٔ اصلاح و تجدید میں قدم رکھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے مخالفتوں کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ ان کی توہین و تضحیک میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا گیا اور کوئی ناگفتنی نہ تھی جو ان کے متعلق نہ کہی گئی ہو۔ لیکن اس مردِ حق آگاہ و مجاہد کا عزم و استقلال زبانِ حال سے گویا تھے۔

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

اسی بنا پر سرسید کے لیے ان میں سے کوئی ایک چیز بھی غیر متوقع نہیں تھی۔ انھوں نے جو پروگرام بنایا اور جو راستہ اختیار کیا تھا اس پر برابر گامزن رہے۔ معترضین اعتراضات کی بوچھار کرتے رہے۔ روک ٹوک کرنے والے استہزاء و تمسخر کے تیروں سے دل چھلنی کرتے رہے۔ لیکن میدانِ عمل کا یہ شہسوار سب کچھ دیکھتا اور سنتا برابر اپنا گھوڑا اُڑاتا آگے ہی بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ساعتِ سعید و مبارک آگئی جب کہ منزل نے خود پیش قدمی کر کے اس کے قدم لیے اور سرسید کا طائرِ آرزو عالمِ جذب و شوق میں زمزمہ پیرا ہوا:-

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

آج ہم سرسید کے گوناگوں کارہائے نمایاں کا جائزہ لیتے ہیں تو حیرت میں غرق ہو جاتے ہیں۔ نہ جانے ان کے دل اور دماغ اور قوائے عملیہ کا خمیر کس آب و گِل سے تیار ہوا تھا کہ انھوں نے تنہا وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دکھایا جسے ایک ادارہ اور ایک انجمن ہی سر انجام دے سکتے ہیں۔ انھوں نے ایک طرف تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر اور وعظ و تذکیر کے ذریعہ قوم میں بیداری پیدا کی۔ اس کو سوچنے اور غور کرنے کا نیا آہنگ اور ڈھنگ دیا۔ حرکت و عمل کے جذبہ و ولولہ نو کی تخلیق کی۔ انگریزوں کے دل و دماغ کو جو مسلمانوں کی طرف سے غبار آلود تھا اس کے مطلع کو صاف کیا اور خود مسلمانوں کو ذہنی اعتبار سے انگریزوں کے قریب لائے اور دوسری جانب اینگلو محمڈن کالج قائم کر کے علوم و فنونِ جدیدہ کی تعلیم کی ایک عظیم یونیورسٹی کی بنیاد رکھی، سائنٹفک سوسائٹی کی تاسیس کر کے اردو کو علوم جدیدہ کی زبان بنانے کی سعی کی۔ ایک رہنما اور قائد کا کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ مردم آفرینی بھی کرے۔ سر سید اس سے غافل نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے فیضِ توجہ و تربیت اور ہر وقت کی نگہداشت سے ایسے لائق و فائق کارکنوں کا ایک گروہ پیدا کیا جو ان کی زندگی میں ان کا رفیق اور وفات کے بعد ان کی روایات اور کاموں کا حامل و امین بنا۔ اور پھر چراغ سے چراغ جلتا چلا گیا۔ علی گڑھ کے ایک ویرانہ میں جو شمع روشن ہوئی تھی اس نے پورے ملک کو اپنی آغوشِ ضیا میں لے لیا۔ سر سید کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ حالانکہ اگرچہ بڑے جانثار تھے مگر انھوں نے جو کچھ کیا ہمت و جرأت اور کمال بیباکی و بے خوفی کے ساتھ کیا اور اس راہ میں وہ نہ حکومت سے مرعوب ہوئے اور نہ اس ملک کی اکثریت سے! ان کی سیاست و تدبیر کار کا شاہکار یہ ہے کہ وہ حکومت اور اکثریت دونوں سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں اور ان کے ہم چشم ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اسلام یا مسلمانوں کے ساتھ جہاں کہیں بے انصافی یا کج اندیشی دیکھتے ہیں اس پر فوراً خود اعتمادی اور قوت سے احتجاج کرتے ہیں۔ لیکن جو کچھ کہتے ہیں وقار، متانت اور سنجیدگی سے کہتے ہیں۔ نہ لب و لہجہ میں چڑچڑا پن ہوتا ہے اور نہ جھنجھلاہٹ۔ نہ تیوری پر بل اور نہ کام و دہن میں غیظ و غضب کے جھاگ۔ سخت سے سخت اشتعال کے عالم میں بھی نہ ان کی زبان بے قابو ہوتی ہے، اور نہ دماغی توازن ساتھ چھوڑتا ہے۔ جو بات ہوتی ہے وہ منطقی استدلال کا پیرایہ لیے ہوئے اور معقولیت سے آراستہ! اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جلد یا بدیر اپنی بات منوا لیتے ہیں اور مخالفوں کو بھی اپنا ہم نوا بنا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ سب صفات و کمالات اسی شخص میں بیک وقت جمع ہوتے ہیں جس کو قدرت پیدا ہی کرتی ہے کسی عظیم خدمتِ انسانی کے لیے۔ چنانچہ سر سید نے اپنی تحریک کے ذریعہ جو نہایت عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے عصرِ جدید کی تاریخ کا کوئی مورخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جو قوم شکست خوردہ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبوں حال تھی۔ سیاسی، علمی، تعلیمی، اقتصادی اور سماجی۔ غرضکہ ہر حیثیت سے پژمردہ اور فرومایہ تھی ساٹھ ستر برس کی مدت میں اس کا چہرہ اور نقشہ بدل گیا۔ اس مختصر مدت میں انگریزوں کے زیر سایہ مسلمانوں نے من حیث المجموع جو ہمہ جہتی ترقی کی ہے، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے بعد کبھی نہیں کی۔

انیسویں صدی کا زمانہ پورے عالمِ اسلام کے انحطاط و تنزل اور پستی کا زمانہ ہے۔ اس بنا پر سرسید کے عہد میں ترکی، مصر، ایران اور انڈونیشیا میں بھی مختلف میدانوں میں بڑے نامور مصلحین و مجددین پیدا ہوئے اور ان کی کوششیں جلد یا بدیر بارآور بھی ثابت ہوئیں۔ لیکن سرسید نے جن حالات میں کام کیا اور جس طرح کیا اور اس کے جو نتائج رونما ہوئے ان سب کے پیشِ نظر اگر سرسید اور ممالکِ اسلامیہ کے ہم عصر مصلحین کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ سرسید کی شخصیت ان سب سے زیادہ قدآور اور بلند و بالا نظر آئے گی۔

سرسید نے اگرچہ کالج میں علوم جدیدہ کے ساتھ دینیات اور اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ برائے بیت تھا اور اس سے ہرگز اس خطرے کا سدِّباب نہیں ہوسکتا تھا جو انگریزی حکومت قائم ہوجانے کے بعد اسلام کو لاحق ہوسکتا تھا، اس خطرے کا کامیاب سدِّباب جس نے کیا وہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کی جماعت ہے۔ اگر یہ جماعتِ علماء، وقت شناسی اور بیدار مغزی سے کام نہ لیتی تو اس ملک میں مسلمانوں کا حال وہی ہوتا جو الجزائر کے مسلمانوں کا فرانسیسی استعمار کے عہد میں ہوا۔ سرسید اور مولانا نانوتوی کے عہد میں اور ان کے بعد مسلمانوں میں متعدد مفید اور عہد آفریں مذہبی اور غیر مذہبی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ لیکن غور کیجئے تو ان سب کا منبع اور سرچشمہ دیوبند اور علیگڈھ ہی کی تحریکیں ہیں، افسوس ہے کہ یہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ اپنے اپنے ڈگر پر چلتی رہیں، اس لیے اس صورتِ حال سے نقصان بھی کچھ کم نہیں پہنچا ورنہ اگر دونوں ایک ساتھ دوش بدوش ہوکر چلتیں تو آج پورے عالمِ اسلام میں برصغیر ہندوپاک کے مسلمانوں کا مشکل سے ہی کوئی جواب ہوسکتا تھا۔

© rasailojaraid.com